ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اقبال کی زندگی

علامہ سر محمد اقبال ۱۸۷۳ء میں بہ مقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ سیالکوٹ ایک نہایت مردم خیز خطہ ہے۔ گزشتہ صدیوں میں بھی یہاں سے بعض ایسے صاحبِ کمال پیدا ہوئے جن کا نام تمام دنیائے اسلام میں آج تک بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جو شاہ جہاں کے زمانے میں تھے اور جن کو اُن کی مشہور تصنیف کے صلے میں چاندی میں تولا گیا تھا یہیں کے رہنے والے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ سیالکوٹ کے مردم خیز ہونے کا ذکر علامہ اقبال سے کیا تو انہوں نے اس کی تصدیق کے لئے تاریخ میں سے ایسے باکمالوں کے نام گنوائے جو اس سرزمین سے اُٹھے تھے۔ سیالکوٹ کا علاقہ کشمیر کی ریاست سے بالکل ملحق ہے اور بڑی کثرت سے کشمیری خاندان اس میں آباد ہیں۔ اقبال کے آبا و اجداد بھی کشمیر ہی سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔ ان کے اسلاف کشمیری پنڈت تھے جن کی ذات سپرو تھی۔ مجھے اُن کے سپرو ہونے کا علم خود اُنہی کی زبانی حاصل ہوا۔ سرتیج بہادر سپرو اپنی علم دوستی کی وجہ سے اقبال کے بڑے قدر دانوں میں تھے۔ خود صاحب موصوف کی زبانی پتہ چلا کہ غالباً چار پانچ پشت ادھر اقبال اور سپرو ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد ایک نے اسلام قبول کر لیا اور اختلافِ مذہب کی وجہ سے اس خاندان کی مختلف شاخیں ایک دوسرے سے بے تعلق ہو گئیں۔

اگرچہ اسلام کے زیر اثر اقبال ذات پات اور نسل پر افتخار کو صحیح نہیں سمجھتے تھے تاہم جا بجا ان کے اشعار میں اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ اُن کو اپنے برہمن زادہ ہونے پر بھی فخر تھا۔ برہمنوں کی ذہانت اور فلسفہ دانی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے اور غالباً از روئے قانونِ توارث اقبال کو اس میں اچھا خاصا حصہ ملا۔

اقبال کے والد گو صاحبِ ثروت نہ تھے لیکن اپنے شہر میں دل و دماغ کی پاکیزگی کی وجہ سے بہت قابلِ احترام سمجھے جاتے تھے۔ بہت عرصہ ہوا جبکہ وہ انارکلی والے مکان میں رہتے تھے مجھے ان سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ اس وقت اقبال کی شہرت تمام ملک میں پھیل چکی تھی، اور اُن کے والد اقبال کے کمال پر بجا طور پر فخر کرتے تھے۔ اُن پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ یہی رنگ اقبال میں علم و شعر کے جوہروں کے ساتھ مل کر اور بھی زیادہ گہرا ہو گیا اور اسی کی بدولت اقبال کو عطار، سنائی اور رومی کی صف میں جگہ ملی۔

اقبال کبھی کبھی اپنے والد کے کشف و کرامات بھی بیان کرتے تھے۔ فرماتے تھے میں نے والدہ کی زبانی سنا ہے کہ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ والد کی موجودگی میں بے چراغ کمرے کے اندر تاریک رات میں عجیب و غریب قسم کا نور ظاہر ہوا

اور تاریک کمرے میں ایسا معلوم ہوُا کہ سورج نکل آیا ہے۔" اقبال کے والد کی گفتگو میں نہایت لطافت اور پاکیزگی پائی جاتی تھی۔ وہ ایک مرتبہ فرماتے تھے کہ اقبال کی پیدائش کے کچھ روز پہلے میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑا ہی عجیب و غریب پرندہ فضا میں زمین کے قریب آرہا ہے اور بڑی کثرت سے لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس ہجوم میں مَیں بھی ہوں وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ میں نہیں آتا لیکن خود بخود میرے دامن میں آکر گرا اور میں نے اسے پکڑ لیا۔

فرماتے تھے "میں نے اس کی اقبال کی پیدائش کے بعد یہی تاویل کی کہ وہ پرندہ یہی بچہ ہے اور یہ ضرور کوئی غیر معمولی کمال پیدا کرے گا۔"

جس کسی کو ان سے ملنے کا موقع ملا ہو اس کو قطعاً اس بات میں شک نہیں ہو سکتا کہ اقبال کو اپنی طبیعت کے بہترین عناصر اپنے باپ ہی سے بچپن میں ملے۔ فارسی کی ایک نظم میں بھی اپنے والد کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا ہے میں نے ایک سائل کو بری طرح ڈانٹا۔ والد مَن رہے تھے اُنھوں نے اس درد انگیز طریقے سے میری اس درشتی پر سرزنش کی کہ اس کے بعد سے آج تک میں کبھی کسی سائل کے ساتھ کسی قسم کی سخت کلامی نہیں برت سکتا۔"

اقبال کو اپنی والدہ سے بھی بہت محبت تھی جس کا ثبوت اس بلیغ اور درد انگیز مرثیے سے ملتا ہے جو انہوں نے اپنی والدہ کی وفات پر لکھا ہے جس کا ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے:

کس کو ہوگا اب وطن میں آہ میرا انتظار؟ — کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار؟
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا — اب دُعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا!
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوُا — گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوُا
دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات — تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی — میں تری خدمت کے قابل جب ہوُا تو چل بسی
وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سرو بلند — تیری خدمت سے ہوُا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا — وہ محبّت میں تری تصویر، وہ بازو مرا
تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ — صبر سے ناآشنا، صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ اُلفت اور محکم ہو گئی

اقبال کو جس زمانے میں اپنے اندر گہرے وجدانی رجحان کا احساس شروع ہوُا تو ایک روز انہوں نے اپنے والد سے اس کا ذکر کیا کہ "میں اپنے اندر کچھ ایسی چیزیں محسوس کرتا ہوں کہ اگر مجھ میں جسمانی کمزوریاں نہ ہوتیں تو شاید میں بھی کسی نہ کسی قسم کا نبی ہو جاتا۔" اس پر ان کے والد نے ہنس کر کہا: "خدا کا شکر ہے کہ تم کو اپنی کمزوریوں کا علم ہے جو تم کو

اس مغالطے میں پڑنے سے بچاتی رہیں گی۔"

انٹرمیڈیٹ تک ان کی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ خوش قسمتی سے اُردو، فارسی اور اسلامیات کے ذوق کی تربیت کے لئے اُن کو ایک ایسے اُستاد سے تلمذ ہُوا جو اپنے زمانے کے بے نظیر شخص تھے۔ مولوی میر حسن بڑے عالم اور سخن فہم شخص تھے۔ اساتذہ کا کلام اُن کو بڑی کثرت سے یاد تھا۔ جو ذوقِ سخن ان کی طبیعت میں تھا اس کو وہ ہونہار شاگردوں میں بھی منتقل کر دیتے تھے۔ کچھ اپنے میلانِ فطرت کی وجہ سے اور کچھ مولوی میر حسن کے فیضِ صحبت کی وجہ سے جوانی کے زمانے میں اقبال کا یہی حال تھا کہ اساتذہ کے ہزارہا اشعار اُن کو یاد تھے۔

سیالکوٹ کا اسکاچ مشن کالج غالباً اس زمانے میں ایف۔ اے تک محدود تھا، اسی لئے بی۔ اے کی تعلیم کے لئے اقبال لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ وہیں سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں بڑے امتیاز سے حاصل کیں۔

اس زمانہ میں اقبال کی خوش قسمتی سے آرنلڈ وہاں فلسفے کے پروفیسر تھے۔ آرنلڈ کو فلسفے کے علاوہ ادبیات کا بھی ذوق تھا اور اسلامیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ جس قدر اقبال آرنلڈ کے شاگرد ہونے پر خوش تھے آرنلڈ اقبال جیسے ذہین اور طباع شاگرد کی اُستادی پر فخر کرتے تھے۔ آرنلڈ کا بیان تھا کہ ایسے طالب علم کے پڑھانے سے خود استاد کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

ایم۔ اے میں فرسٹ آنے کے صلے میں اقبال کو نانک بخش مڈل ملا۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے پروفیسر بھی رہے۔ جب پروفیسر آرنلڈ ولایت جانے لگے تو اقبال کو اپنے ساتھ چلنے پر بہت مجبور کیا۔

اقبال کی انگلستان کو روانگی

اقبال کے اس سفرِ یورپ میں اُن کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے اُن کی بڑی مدد کی شیخ صاحب موصوف کی آمدنی اگرچہ محدود تھی۔ لیکن ان کو اپنے چھوٹے بھائی سے ایسا عشق تھا کہ اُنھوں نے اپنا تمام سرمایہ بے دریغ ان کے حوالے کر دیا۔ اقبال بھی جب اپنے بھائی کا ذکر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی معشوق کا ذکر کر رہے ہیں۔ دونوں بھائیوں کا یہ گہرا عشق آخر عمر تک بدستور قائم رہا۔

اقبال ۱۹۰۵ء میں عازمِ انگلستان ہوئے۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ اپنی چند نظموں کی وجہ سے ایک اعلیٰ درجے کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ جو نظمیں اُنھوں نے انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسوں میں پڑھیں۔ یا سر عبدالقادر کے "مخزن" میں شائع ہوئیں وہ ایسی بلند پایہ نظمیں تھیں کہ ہر سخن فہم کو احساس ہو گیا تھا کہ آسمانِ شعر پر ایک نیا آفتاب طلوع ہُوا ہے۔

انگلستان میں وہ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ زیادہ تر ان کا تعلق پروفیسر وآئٹ اور سارلے سے رہا یا پروفیسر براؤن سے۔ پروفیسر نکلسن سے کیمبرج میں میں نے دریافت کیا تھا کہ آیا طالب علمی کے زمانے میں وہ اقبال کو جانتے تھے۔ اُنھوں نے فرمایا "نہیں، میں اس زمانے میں اُن سے واقف نہ تھا۔"

انگلستان کے دورانِ قیام میں مغربی فلسفے کے علاوہ اقبال نے اسلامی فلسفے کی طرف رجوع کیا اور بڑی تحقیق سے اسلامی تعلیمات کے فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ اس تحقیق کا حاصل وہ مقالہ ہے جو "Metaphysics of Persia" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مقالہ کی بنا پر میونخ یونیورسٹی سے اُن کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملی۔ لندن میں اُنہوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ اس زمانے میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے وہ کچھ عرصے لندن میں عربی کے پروفیسر بھی رہے۔ انگلستان کے زمانۂ قیام میں اُنہوں نے چھ لیکچر اسلام پر بھی دیئے۔

واپسی ۱۹۰۸ء میں وہ وطن واپس لوٹے۔ علمی شوق کی وجہ سے زیادہ موزوں بات تو یہی تھی کہ وہ پروفیسر ہوتے۔ لیکن کسی وجہ سے اُنہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ ملازمت نہ کریں گے۔ اس زمانے میں انڈین ایجوکیشنل سروس میں پنجاب میں غالباً کوئی ہندوستانی نہیں تھا۔ یہ سروس زیادہ تر انگریزوں کے لئے مخصوص تھی۔ لیکن اقبال کے علم کا چرچا اس وقت بھی ایسا تھا کہ خود گورنمنٹ نے ان کے سامنے یہ خدمت پیش کی۔ لیکن اقبال نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے دوستوں کو بڑا افسوس تھا کہ اُنہوں نے ایسا نادر موقع ہاتھ سے کیوں کھو دیا۔ جسٹس شاہ دین مرحوم اس زمانے میں ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اس بارے میں وہ اقبال سے بہت ناراض تھے۔ اور ان سے ہمیشہ کہتے تھے "تم جیسے آدمی کا عدالت میں کوئی کام نہیں۔ تمہیں علمی زندگی کو بطور پیشے کے اختیار کرنا چاہئے"۔ میں نے ان سے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ "آیا یہ بہتر نہیں تھا کہ آپ پروفیسر ہو جاتے؟" فرمانے لگے "میں نے کچھ دن پروفیسری کی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں۔ البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں"۔ فرماتے تھے ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی کلرک سے باتیں کرتا ہے۔ اس دن سے ملازمت سے طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ جی میں ٹھان لی کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے گریز کروں گا۔ اپنے اسی خیال کو اُنہوں نے اسرارِ خودی میں بیان کیا ہے:

رزقِ خویش از دستِ دیگر الحذر
الحذر از نانِ چاکر الحذر

انگلستان کے دورانِ قیام میں قومی احیاء کے خیالات ان کی طبیعت میں موجزن ہوتے گئے تھے۔ وہاں اُنہوں نے جو نظمیں لکھیں اُن سے انہیں خیالات کا پتہ چلتا ہے۔

ہر شاعر جو دیگر کمالات کی بھی اہلیت رکھتا ہو کبھی کبھی شاعری کو لاطائل بھی سمجھنے لگتا ہے۔ اقبال کو انگلستان میں خیال ہوا کہ مسلمانوں میں شاعری انحطاط کے ساتھ وابستہ ہے اور اس قوم کو مزید شاعری کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے ارادہ کیا کہ وہ شاعری چھوڑ دیں گے اور کوئی ایسا کام کریں گے جس سے قوم میں بیداری اور قوتِ عمل پیدا ہو۔ اس وقت تک اُن کو اس کا پوری طرح احساس نہیں ہوا تھا کہ شاعری کا رُخ بدل کر بھی یہ کام بطریقۂ احسن اس سے لیا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں سر

عبدالقادر بھی انگلستان ہی میں تھے، اور دونوں ساتھ ہی رہتے تھے۔ سر عبدالقادر کو اس کا خطرہ ہوا کہ کہیں سچ مچ اقبال شاعری ترک نہ کردیں۔ اس معاملے میں دونوں میں بحث ہوگئی بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ پروفیسر آرنلڈ سے مشورہ کیا جائے اور اس کے بعد قطعی فیصلہ کیا جائے۔ دنیائے ادب کے لئے یہ نہایت خوش قسمتی کی بات ہے کہ آرنلڈ نے ان کو صحیح مشورہ دیا اور اُن سے کہا کہ بلند پایہ شاعری سے قوم کا ایسا تعمیری کام ہو سکتا ہے جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ اس پر اقبال کچھ نرم پڑ گئے اور ان کا وہ خیال رفتہ رفتہ جاتا رہا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ارادہ بھی کیا کہ شاعری کو محض تفنن طبع کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ اس کی تمام قوت قوم کے اندر صحیح جذبات پیدا کرنے کے لئے صرف کی جائے۔

انگلستان سے واپسی پر اقبال بیرسٹری کے پیشے میں اپنے آپ کو استوار کرنے لگے۔ اگرچہ ان کو اپنی ذہانت، محنت اور شہرت کی وجہ سے کچھ نہ کچھ کام ملتا رہتا تھا۔ لیکن دیر تک اُن کو یہ پتہ نہ چلا کہ اُن کی بیرسٹری اُن کی شاعری میں حائل ہے اور ان کی شاعری ان کی بیرسٹری میں مزاحم۔ عمر کا ایک نہایت ہی قیمتی حصّہ اُنہوں نے اس پیشے پر ضائع کیا۔ میں نے اُن سے ایک مرتبہ کہا "آپ نے یہ دو متضاد سے شغل کیوں اختیار کر رکھے ہیں؟" فرمانے لگے "اس تضاد سے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ وکالت دنیاداری کا نچوڑ ہے۔ تمام جہان کی کثافتوں اور خباثتوں سے انسان اس پیشے میں آشنا ہو جاتا ہے۔ اور طبیعت میں اس کے خلاف ایک ایسا ردِ عمل پیدا ہوتا ہے کہ بڑے زور سے انسان کی روح لطیف چیزوں کے حصول کے لئے بال و پر پھیلاتی ہے۔" اس پر اُنہوں نے یورپ کے بعض ایسے لوگوں کا ذکر کیا جو شاعر بھی ہیں اور بیرسٹر بھی۔ اقبال کے انتقال کے بعد مجھے اُن کا یہ فرمانا یاد آیا۔ کیونکہ جس اخبار میں اُن کی خبر انتقال درج تھی اس میں ساتھ ہی یہ خبر بھی تھی کہ اسی روز سر ہنری نیو بولٹ انگلستان کے مشہور شاعر بیرسٹر کا بھی انتقال ہوگیا۔ دونوں کی خبر وفات ٹائمس میں ساتھ ہی ساتھ چھپی تھی۔

جتنی مدت اقبال بیرسٹری کرتے رہے عام علمی مشاغل ان سے نہیں چھوٹے۔ وقتاً فوقتاً وہ شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس شغل کے لئے وہ اتنا ہی وقت دے سکتے تھے جتنا اپنے پیشہ کے مشاغل سے بچ جاتا۔ قانون کی کتاب وہ اہم مقدمے کی تیاری ہی کے وقت دیکھتے ہو۔ کیونکہ سینکڑوں ملاقاتوں میں میں نے اُن کو اکثر فلسفے، ادب، تاریخ اور مذہب وغیرہ کی کتابیں پڑھتے ہوئے دیکھا لیکن کبھی قانون کی کتاب اُن کے ہاتھ میں نہیں دیکھی۔

بیرسٹری کے بہترین زمانہ میں بھی اُن کی آمدنی کبھی ایک ہزار روپے سے متجاوز نہیں ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے وقت ریاست کے بعض عہدہ داروں کا خیال ہوا کہ اقبال کو بہ طور پرنسپل کے یہاں بُلایا جائے۔ میں نے اُن سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس کے خواہش مند نہیں تھے۔ فرماتے تھے:

"تنخواہ کے لحاظ سے تو مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اگر تھوڑی سی رقم مجھے زائد مل جائے تو اس کے لئے جلا وطن ہونا کوئی معقول فعل نہیں۔"

اس زمانے میں وہ بڑی کثرت سے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے امتحانات کے ممتحن بنائے جاتے تھے۔

سینکڑوں جوابی بیاضوں کے پلندے ان کے پاس پڑے رہتے تھے۔ امتحانوں کے پرچے دیکھنے کا کام کچھ ایسا میکانکی ہو جاتا ہے کہ وہ بیاضیں پڑھتے بھی جاتے تھے اور ہم نشینوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ پرچوں کو غور سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ذمے اوّل تو کسی کام کے لینے سے بہت گریز کرتے تھے لیکن اگر کوئی کام اپنے ذمے لیتے تھے تو اس میں پوری کوشش صرف کرتے تھے۔

بیس برس سے زیادہ عرصے تک بیرسٹری اور شاعری کا دوہرا مشغلہ جاری رہا۔ اس زمانے میں عام قاعدہ تھا کہ ہر پلیڈر لیڈر بننے کی کوشش کرتا تھا جس کی طرف اکبر الٰہ آبادی نے ظریفانہ اشارہ کیا ہے:

موکّل چھوٹے ان کے پنجے سے جب تو پھر قومِ مرحوم کے سر ہوئے
پپیہے پکارا کئے "پی کہاں" مگر وہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے

اقبال کی سلامتیٔ طبع کی یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ اس لالچ میں نہیں آئے۔ ان کو پبلک لائف میں گھسیٹنے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن وہ اس سے گریز کرتے رہے۔ اس زمانے میں سیاسیات کا جو رنگ تھا اقبال کو اس میں غلامانہ سیاست کی بُو آتی تھی اور وہ کہتے تھے "جب تک صورتِ حال یہ ہے لیڈر کسی قدر قوم فروشی ہی کے ساتھ پنپ سکتے ہیں" جس کے لئے وہ اپنی طبیعت کو آمادہ نہیں پاتے تھے۔ اسی کیفیت پر انہوں نے وہ نظم لکھی ہے جس میں انہوں نے لیڈری کا نقشہ کھینچا ہے۔

میں نے اقبال سے از راہِ نصیحت یہ کہا عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز
تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکرِ حجاز
ختم تقریر تری مدحتِ سرکار پہ ہے فکرِ روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز
اس پہ طرّہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے تیری مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی تجھ کو لازم ہے کہ ہو اُٹھ کے شریکِ تگ و تاز

غرض اس تمام نظم میں انہوں نے لیڈروں کے اخلاق کا خاکہ کھینچا ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ یہ سب کمال اور کمزوریاں مجھ میں بھی موجود ہیں چاہوں تو اچھا خاصا لیڈر ہو جاؤں۔ لیکن ایک بڑے ضروری عنصر کی کمی ہے۔ فرماتے ہیں:

سن کے کہنے لگا اقبال "بجا فرمایا شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز
مجھ میں اوصافِ ضروری تو ہیں موجود مگر ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی"

۲۰، ۱۵ برس تک اسی خیال پر قائم رہنے کے بعد آخر سیاسی حالات کے انقلاب اور بعض احباب کی

ترغیب نے اُن کو اس میدان میں گھسیٹا۔ اس کے بعد وہ پنجاب کی اسلامی سیاست میں پیش پیش رہے۔ مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ بھی ہوئے، مسلم کانفرنس کے روحِ رواں بھی رہے اور پنجاب کونسل کے ممبر بھی ہوئے۔ میں نے ان سے ایک روز مذاق سے کہا "کیوں جناب! آپ تو کونسلوں کو سرمایہ داروں کا اکھاڑہ کہتے تھے اب خود اس میں کیسے شریک ہو گئے؟" فرمانے لگے "جو کہتا تھا وہ ٹھیک تھا، میں اسی لئے شریک ہوا ہوں کہ اندر سے اس کی بیخ کنی کی جائے۔"

کچھ سال کے تجربے کے بعد اُن کو محسوس ہوا "میں عملی سیاست کا مردِ میدان نہیں بن سکتا۔ مجھ کو اس سے بلند تر کام کرنا چاہیئے اور شعر کے ذریعے ایک طرف تو قوم کے دلوں میں تغیّر پیدا کرنا چاہیئے اور دوسری طرف لیڈروں کی نیتوں کی باگ خاص نصب العین کی طرف موڑنی چاہیئے۔"

اقبال زندگی کے کسی شعبے میں بھی عملی آدمی نہیں تھے۔ افکار و اثرات نے اُن کی تمام شخصیت پر قبضہ کر لیا تھا۔ مسلمانو میں چونکہ قحط الرجال ہے اس لئے یہ قوم ایک ہی انسان سے مختلف اور متضاد تقاضے کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ ایک شخص شاعر بھی ہو، فقیہ بھی ہو، قومی لیڈر بھی ہو اور پیر و مرشد بھی ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند"۔ ہر اہلِ کمال کسی خاص صنف میں کمال رکھتا ہے اور دوسری سمتوں میں اس کی استعداد اوسط سے بھی گر جاتی ہے۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے لیڈر اقبال کے اشعار سے اپنی روحوں میں گرمی پیدا کرتے تھے اور ان کے اشعار کے پیدا کئے ہوئے جوش کو عمل میں تبدیل کرتے تھے۔ ان میں سے بعض لیڈر جو شاعر کی نفسیات سے واقف نہیں تھے اقبال پر طعنہ زن ہوتے تھے "تم نے ہم کو مومن بنا دیا لیکن خود کافر کے کافر ہی رہے۔"

ایک مرتبہ مولانا محمد علی نے اقبال سے یہی کہا۔ اقبال نے جواب دیا: "سنو بھائی تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ہوتی ہے تو قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ہے۔ لیکن سننے والے ہُو حق کرتے ہیں، وجد میں آتے ہیں، ناچتے ہیں، مضطرب ہوتے ہیں، بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر یہی کیفیتیں قوال پر بھی طاری ہوں تو قوالی ختم ہو جائے۔ میں تو قوم کا قوال ہوں میں گاتا ہوں تم ناچتے ہو، کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ناچنا شروع کر دوں؟" اس بیان میں اقبال نے ایک بڑے ظریفانہ انداز میں ایک بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جس طرح فطرت میں تقسیمِ عمل ہے اسی طرح افراد میں بھی تقسیمِ عمل ہونی چاہیئے۔

سیاست اور وطن پرستی

جہاں تک سیاسی افکار، تاثرات اور نصب العین کا تعلق ہے اقبال کی سیاست کے تین پہلو تھے۔ ایک طرف تو وہ تمام بلند پایہ مفکرین و مصلحین کی طرح تمام نوعِ انسان کی بہتری کے متعلق سوچتا تھا۔ اس کی شاعری کا بیشتر حصہ انسانی زندگی کے نصب العین سے تعلق رکھتا ہے اور براہِ راست ملکی سیاست سے بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ محض مخصوص گروہوں کے متعلق سوچنا عملی سیاست دانوں کا کام ہے۔ اعلیٰ درجے کے شاعر، حکیم یا نبی مخصوص گروہوں کو اپنی نظر گاہ نہیں بناتا۔ اقبال ہی کے مماثل جرمنی کا سب سے بڑا شاعر اور مفکر گوئٹے ہے جس کا

زمانہ جرمنی کا وہ پُرآشوب زمانہ تھا جس میں نپولین نہ صرف جرمنی کو بلکہ تمام یورپ کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ گوئٹے اس تمام ہنگامے سے کچھ ایسا بے تعلق معلوم ہوتا تھا کہ بعض نقادوں نے اس کو متہم کیا ہے کہ اس میں جذبۂ حب الوطنی کی کمی تھی۔ اس قسم کی تنقید کوتاہ نظری ہی پر مبنی ہو سکتی ہے۔ وہی گوئٹے جس نے براہِ راست اس وقت کی عملی سیاست میں نہ قلم سے حصّہ لیا اور نہ عمل سے اپنے افکار کی بدولت جرمنی کی علمی اور ادبی عظمت کا بانی ہے۔ اقبال کے متعلق بھی صورتِ حال اسی قسم کی ہے۔ اس نے شروع میں حبِ وطن کے عام جذبات کے ماتحت بڑی پُرجوش نظمیں وطن پر لکھیں جن سے بہتر آج تک کوئی ہندوستانی شاعر نہیں لکھ سکا۔ لیکن اس دَور کے بعد اس کی نظر وطن سے بے تعلق تو نہیں ہوئی لیکن وطن سے بلند ہو گئی۔ اور وہ اس نقطۂ نظر پر آ گیا جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ کسی قوم میں تغیر حقیقی طور پر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس قوم کے نفوس میں تغیر پیدا نہ ہو۔ سیاست داں کی نظر فقط ظاہر پر پڑتی ہے اور وہ فقط سطحی تغیرات کی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔ لیکن حقیقی مصلح کی نظر اساسیات پر پڑتی ہے اور سیاست داں کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع اور دور رس ہوتی ہے۔ سیاست داں محض ابن الوقت ہوتا ہے اور معاملات کی گتھیاں جیسے جیسے پیدا ہوتی جاتی ہیں اُن کو سلجھانے کے لئے وہ قاعدے اور قانون بناتا رہتا ہے جن کی تہ میں کوئی پائدار حقیقت نہیں ہوتی۔ اقبال کو یہ خیال ہُوا کہ وطن کے متعلق کورانہ جوش کو ابھارنے کا وہی نتیجہ ہوگا جو مغرب نے بیجا حب الوطنی سے پیدا کیا ہے۔ جغرافیائی حدود کی پرستش سے انسان کی نظر تنگ، اس کی عقل بہانہ جو اور اس کا دل حقیقی عشق سے محروم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اہلِ وطن کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں محض یورپ کی حب الوطنی کی تقلید نہ ہو بلکہ عدل و انصاف کا راستہ صالحانہ جد و جہد سے سب کے لئے کھل جائے۔ وطن کی صحیح محبت اُس کے دل میں آخر تک موجود تھی اور وہ اس کو ایک فطری جذبہ خیال کرتا تھا۔ آخر تک اپنی فارسی نظموں میں جہاں کہیں وہ ہندوستان کا ذکر کرتا ہے اس کے بیان میں بڑا درد اور سوز و گداز ہوتا ہے۔ وہ ہر قسم کی غلامی سے بیزار تھا اور وطن کو نہ صرف سیاسی بلکہ اقتصادی، عقلی، مذہبی اور اخلاقی غلامی سے بھی آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی سیاست کا دوسرا پہلو اس امر کے ساتھ وابستہ ہے کہ وہ صرف ہندی ہی نہیں بلکہ ہندی مسلمان تھا۔ اس نقطۂ نظر میں وہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا نمایندہ تھا جہاں تک سیاست کا تعلق گروہوں کی اصلاح اور ارتقاء سے ہے وہ جس طرح ہندوستان کی آزادی اور اس کے لئے اعلیٰ درجے کے اقتدار کا آرزومند تھا اسی طرح وہ تمام اسلامی دنیا کی آزادی اور اس کی ترقی کا متمنی تھا۔

ہندوستان کے بعض غیر مسلم حضرات مسلمان کی اس فطرت سے آشنا نہیں تھے چنانچہ جب کوئی مسلمان ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا سے متعلق دلچسپی یا جوش اور جذبے کا اظہار کرتا تھا تو وہ یہ سمجھنے لگتے تھے کہ یہ ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتا اور وطن پرست یا قوم پرست نہیں ہے۔ وہ نہیں سمجھتے تھے کہ مسلمان بھی ہندوستان کی پستی سے اتنا ہی دل گیر ہے جتنا کہ اور کوئی غیر مسلم وہ بھی ہندوستان کی عزت کو اپنی عزت اور ہندوستان کی ذلت کو اپنی ذلت سمجھتا ہے اس کا وجودِ خاکی بھی اسی سرزمین سے اُبھرا ہے اور اسی میں پیوند ہو جاتا ہے لیکن اسلام نے اس کو ایک ایسی برادری کا بھی رکن بنایا ہے جو جغرافیائی حدود سے ماورائی ہے۔ سرکش

اور چین کے مسلمان کی سیاسی اور تمدنی کشمکش کے ساتھ بھی اس کے دل کو وہی رابطہ ہے جو خود اپنے وطن کی جدوجہد سے ہے۔

مسلمان کی وسعتِ قلب میں وطن کے لئے ایک نہایت عزیز مقام موجود ہے لیکن وطن سے ماوریٰ دنیا کی اسلامی برادری کو بھی وہ اپنے دل سے الگ نہیں کر سکتا۔ جب تک اسلام کے نصب العین میں کوئی قوت باقی ہے ہر سلیم القلب مسلمان کی طبیعت میں یہ دونوں جذبے بیک وقت موجود رہیں گے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ایک جذبہ دوسرے کے منافی ہے۔ آخر کار ہندوستان کے غیر مسلم راہنما پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی سیاست میں یہی نقطۂ نظر اختیار کرنا پڑا کہ ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو نہ کوئی ہندوستانی سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی صحیح راہِ عمل پیش کر سکتا ہے جب تک کہ باقی اقوام کی سیاست کو بھی ساتھ ملا کر اس پر غور نہ کیا جائے۔ جس زمانے میں مسٹر گاندھی اور اُن کے شرکاء نے خلافت کی تحریک میں عملی حصہ لیا باوجود اس امر کے کہ خلافت سے غیر مسلموں کو کوئی تعلق نہیں تھا، مسٹر گاندھی کی اس جدوجہد میں کسی کے دل میں یہ شک و شبہ پیدا نہیں ہوا کہ گاندھی جی ہندوستان کی سیاست سے دور ہٹ گئے ہیں۔ اس زمانے میں لالہ لاجپت رائے نے جو ہندوؤں کے نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی لیڈر بھی تھے ایک مضمون لکھا جس کا موضوع یہ تھا کہ ہندوستان کبھی آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسلامی ممالک بھی آزاد نہ ہوں۔ ہندوستان کی آزادی اور غلامی، ان ممالک کی آزادی اور غلامی سے غیر منفک طور پر وابستہ تھی۔ یہی نقطۂ نظر لینن کا بھی تھا۔ حالانکہ وہ اپنی تحریک کو مذہب کے خلاف ایک جہاد سمجھتا تھا۔ محض اپنے سیاسی اور معاشی پروگرام کو مدِنظر رکھتے ہوئے لینن کا یہ خیال تھا کہ جب تک اسلامی ممالک آزاد نہ ہوں یورپ کی سرمایہ داری اور ملوکیت کو شکست نہیں ہو سکتی۔

ان حقائق سے آشنا ہونے کے بعد کوئی کج اندیش شخص ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اقبال کا جذبہ جو اسلامی دنیا کے متعلق تھا اس کی حُبِّ وطن سے کوئی الگ چیز تھا۔ حریّت کی ایک ہی پیکار کے یہ دو حربے تھے اور یہ دونوں حربے اقبال کی شاعری میں نمایاں اور ساتھ ساتھ موجود ہیں۔

اقبال جب کہتا ہے کہ انسان کو وطنیت سے پاک ہونا چاہئے اور اس کی گرد کو دامن سے جھٹک دینا چاہئے تو اس سے اس کی مراد فقط وہ غلط وطنیت کا جذبہ ہے جس نے مغربی اقوام کو اندھا کر دیا۔ وہ اس غلط وطنیت سے بچا کر اپنے ہم وطنوں کو وطنیت کے اس جذبے کی طرف لانا چاہتا تھا جو کسی خاص زمین کے ٹکڑے کی پرستش پر مبنی نہ ہو بلکہ انسان اور اس کی روحانی ترقی کے ماتحت ہو۔ ہندوستان کے دوسرے مشہور عالم شاعر ٹیگور کا نقطہ نظر بھی اقبال سے کچھ الگ نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ٹیگور میں جذبۂ وطنیت کی کمی تھی۔ لیکن مغربی رنگ کی وطن پرستی کے خلاف ٹیگور نے بھی اپنی آواز بلند کی۔ ٹیگور نے دنیائے ادب میں انسانی دلوں پر جو سکہ بٹھایا ہے وہ وطن کے متعلق راگ گا کر نہیں کیا ہے۔ بلکہ روحِ انسانی کی گہرائیوں میں ڈوب کر کیا ہے اور ایسے افکار و تاثرات کی بدولت اس کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی جو ذات پات، نسل اور رنگ، اور جغرافیائی حدود سے بلند تر ہیں۔

اقبال ہندوستان کی آزادی اور عظمت کے طالب تھے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے اُن کی روح میں بڑی بے تابی تھی۔ لیکن ان کو یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ آزادی محض آقاؤں کی تبدیلی نہ ہو اور ظلم کی قوتیں جوں کی توں گوروں کے ہاتھوں سے نکل کر کالوں کے ہاتھوں میں نہ آجائیں۔ سچی آزادی کے لئے وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ہر گروہ کو نہ صرف نصب العینی طور پر مساوی حقوق حاصل رہیں بلکہ آئین و قوانین اس انداز کے وضع کئے جائیں کہ اس وقت ملک میں جو گروہ جس حیثیت سے پس ماندہ اور مظلوم ہیں ان کی پس ماندگی اور مظلومیت کا علاج کیا جائے۔

بعض نام نہاد قوم پرست انگریزوں سے صرف سیاسی قوت چھین لینے کے درپے تھے۔ اور اُن کے ضمیر میں وہ عدل پیدا نہیں ہوا تھا جو تمام انسانوں کے لئے مساوی طور پر ترقی کی راہیں کھول دے۔ لیکن اقبال کے دل میں ہندوستان کے تمام مظلوم طبقوں کے لئے بڑا درد تھا اور اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز ان کی نگاہ میں نہیں تھی۔ جب وہ مسلمانوں کے جائز حقوق کی حمایت گول میز کانفرنس میں کر رہے تھے تو اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی دیگر پس ماندہ اقوام کو بھی شریک کرتے تھے۔ بے سرمایہ اور محروم مزدور کسانوں کی حمایت میں جو کچھ انہوں نے لکھا اس میں کیش و ملت کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔

اقبال بھی وطن کی آزادی کا ایک پُرجوش مجاہد تھا۔ لیکن مغربی انداز کی وطن پرستی کو بت پرستی سمجھتا تھا۔ جہاں دوسری قسم کے اصنام کو توڑنے کا کام اس نے اپنے ذمے لیا وہاں یہ بڑا بُت بھی اس کی ضرب و حرب سے نہیں بچ سکتا تھا۔

فکرِ اقبال

مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

یہ بلند پایہ تصنیف اقبالیات میں گراں قدر اضافہ ہے۔ جس میں حضرت علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ کے ہر پہلو کی دل نشیں اور حکیمانہ انداز میں تشریح کی گئی ہے۔

قیمت دس روپے

ملنے کا پتہ

سکرٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور